حکیم مولانا سیّد عبدالحئ الحسنی مرحوم

ہندوستان کا قدیم نصابِ تعلیم

یہ مضمون دراصل مولانا سیّد عبدالحئ مرحوم نے اُردو میں لکھا تھا اور رسالۂ الندوہ میں دَورِ اوّل میں شائع ہوا تھا۔ عربی ترجمہ الضیاء میں ۱۹۳۲ء میں چھپا تھا۔ موجودہ مترجم نے غالباً عربی ترجمے کو اصل سمجھ کر اس کا پھر سے اُردو میں ترجمہ کر دیا۔ بہرحال مضمون مفید اور قابلِ قدر ہے، اس لیے ہم اس کو شائع کیے دیتے ہیں۔ [ادارہ]

ہندوستان میں اسلام کی آمد بڑی حد تک خراسان اور ماوراءُ النہر کی راہوں سے ہوئی ہے اور فطری طور پر عربی علوم کا ذخیرہ بھی انھیں راستوں سے یہاں تک پہنچا۔

یہ دونوں مقامات قدیم یونانی فلسفہ وحکمت کا گہوارہ تھے اور کسی حد تک انھیں علم نحو، فقہ اور کلام میں بھی ایک خاص مقام حاصل تھا۔

اس سرزمین پر اسلام کا پرچم لہرانے کے بعد ہمارے علمی مراکز میں بھی سب سے پہلا مرکز ملتان بنا جہاں کے علماء کی بڑی تعداد نے اپنے علم وفضل کا سکّہ بٹھا دیا۔ عہدِ غزنی میں لاہور کو یہ مقام حاصل ہوا اور پھر رفتہ رفتہ توسیعِ سلطنت کے ساتھ ساتھ یہ مراکز بدلتے رہے۔ غوریوں کے دہلی فتح کرنے کے بعد علوم وفنون کا مخزن دہلی بن گئی جہاں سارے اہلِ فن جمع تھے۔ اسے مغلوں کے زوال تک یہی حیثیت حاصل رہی۔

گجرات ہمیشہ سے علماء اور اہلِ دانش کا مرجع رہا ہے۔ یمن کے گہوارۂ علم سے آنے والے علماء نے اسی خطّے کو اپنا مرکز بنایا، جہاں بڑے بڑے اہلِ کمال نے درس وتدریس کی منازل طے کیں۔ اسی کا فیض تھا کہ گجرات سے لے کر دکن اور مالوے تک آفتابِ علم کی

شعاعیں جلوہ گر رہیں۔ ان علماء میں سرِ فہرست بدر الدین یمنی، خطیب کاذرونی اور عماد طارمی وغیرہ کے نام ہیں۔

دہلی کی مرکزی حیثیت ختم ہو جانے کے بعد تیموری فتنے سے جو زوال وانحطاط طاری ہوا اس کے نتیجے کے طور پر علماء کا ایک گروہ جن میں شیخ ابوالفتح بن عبدالحئ بن عبدالمقتدر دہلوی، شیخ احمد بن محمد تھانیسری، قاضی شہاب الدین دولت آبادی شامل تھے، جونپور منتقل ہوا اور ان کے دم سے یہ خطہ بھی مرکزِ علم بنا۔ یہاں سے فیض پا کر بڑے بڑے فضلاء نے اپنے فنون میں مہارت حاصل کی اور مشرقی ہند کا یہ خطہ مطلعِ انوار بن گیا۔ لکھنؤ نے بھی اسی شہر جونپور سے اکتساب فیض کر کے اہلِ کمال کو جنم دیا۔ جن میں دورِ آخر کی یادگار مُلّا نظام الدین سہالوی فرنگی محلی کی شخصیت ہے۔

عربی مدارس کا رائج الوقت نصابِ تعلیم عموماً یہی درسِ نظامی رہا ہے جس کو ملا نظام الدین نے ترتیب دیا تھا۔ اس وقت سے اس نصاب کو برابر علماء وفضلاء کی تائید حاصل رہی ہے۔ ملا نظام الدین کے خاندان نے بڑے بڑے علماء تیار کیے۔ اپنے زمانے میں اودھ کا پورا علاقہ شیرازِ ہند بن گیا جو سارے ملک میں اپنے علمی اور دینی فیوض کے لحاظ سے ممتاز ترین خطہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے چھوٹے چھوٹے قصبات اور دیہات تک میں اہلِ کمال پیدا ہوئے۔ بلگرام، ہرگام، جائس، نیوتنی، گوپامئو، امیٹھی، سندیلہ، کاکوری اور خیرآباد کسی زمانے میں علماء کے مسکن تھے اور آج اُجڑے ہوئے کھنڈرات نظر آتے ہیں۔

ہندوستان میں رائج ہونے والے نصابِ تعلیم کو ان تبدیلیوں کے لحاظ سے جو وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں، چار اَدوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ہم ترتیب وار ہر دَور کے نصاب کا ذکر کریں گے جو طویل علمی کاوشوں اور برسوں کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔

دَورِ اوّل:

ساتویں صدی سے نویں صدی تک دو سو سال کی اس مدت میں جو نصاب رائج رہا

اس میں نحو، بلاغت، فقہ، اصولِ فقہ، منطق، کلام، تصوف اور تفسیر کے مضامین کو اصولی حیثیت حاصل تھی۔

فنِ نحو کی کتابوں میں مندرجہ ذیل کتب شاملِ نصاب تھیں:

''مصباح''—''کافیہ''—''لب الالباب'' (مصنفہ قاضی ناصر الدین بیضاوی)، ''ارشاد'' قاضی شہاب الدین دولت آبادی— اور ''کافیہ'' کے بعض حواشی جو قاضی شہاب الدین اور ان کے تلامذہ کی تصنیف تھی۔

فقہ میں کتبِ ذیل شاملِ نصاب تھیں:

المتفق — مجمع البحرین، قدوری، ہدایہ

اصولِ فقہ میں:

حسامی، المنار، اصول البزدوی

تفسیر میں:

مدارک، بیضاوی، کشاف

تصوف میں:

العوارف والتعرف، نقد النصوص

حدیث میں:

مشارق الانوار (امام صنعانی)، مصابیح السنۃ (امام بغوی)

ادبِ عربی میں:

مقاماتِ حریری، جس کے ساتھ یہ رواج رہا ہے کہ اس کتاب کو حفظ یاد کرایا جاتا تھا۔ مشہور ہے کہ سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء نے اس کتاب کو شیخ شمس الدین خوارزمی سے پڑھا تھا اور اس کے چالیس مقامے زبانی یاد کیے تھے۔

منطق میں

شرحِ شمسیہ۔

کلام میں:

شرحِ صحائف اور عقیدہ نسفیہ کا رواج تھا۔

اسی طرح کچھ لوگوں نے قصیدہ لامیہ اور ابوشکور سالمی کی کتاب ''التمہید'' بھی شامل کی تھی۔

زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فضیلتِ علمی کے معیار بھی بدلتے رہتے ہیں۔ جس زمانے میں جس فن کو خاص اہمیت حاصل تھی، اسی میں مہارت کو معیارِ قابلیت سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ دَورِ اوّل میں فقہ اور اصولِ فقہ کو معیارِ فضیلت و کمال سمجھا جاتا تھا جس طرح آج سے کچھ پہلے فلسفہ و حکمت کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ ابتدائی دَور میں فقہ کی خاص اہمیت کی بنا پر اس زمانے میں فتاویٰ اور فقہی روایات کی کثرت پائی جاتی ہے۔

عام دستور مسائلِ فقہی میں ائمہ مجتہدین کی تقلید کا تھا اور ان کی رائے کو کتاب و سنّت کی کسوٹی پر کسنے کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔

فنِ حدیث میں ان کی آخری پہنچ صنعانی کی مشارق الانوار تک تھی یا پھر مصابیح السنۃ (بغوی) کو کافی سمجھا جاتا تھا، ان تمام امور کا تعلق حدیث سے بے اعتنائی اور فنِ حدیث سے ناواقفیت سے تھا۔

مشہور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ سماع کے قائل تھے اور ان کے عہد کے علماء اس کی شدید مخالفت کرتے تھے۔ غیاث الدین تغلق کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے مناظرہ کی دعوتِ عام میں فقہاء و قضاۃ کے سامنے شیخ نظام الدین کو پیش کیا۔ حضرت نظام الدین نے سماع کے جواز پر احادیثِ رسولؐ سے استدلال کیا جس کی تردید فقہاء و قضاۃ نے یہ کہہ کر کر دی کہ ہمارے یہاں فقہی روایات احادیث پر مقدم ہیں۔ یہ بھی منقول ہوتا چلا آیا ہے کہ بعض علماء نے یہ کہہ دیا ہے کہ چونکہ ان احادیث کو امام شافعی جیسے دشمنِ دین نے استعمال کیا ہے اس لیے ہم انھیں سننا گوارا نہیں کرتے۔

فقہاء و قضاۃ کے ان نامناسب اقوال پر غور فرمایئے۔ ان کی یہ ساری جرأت و بیباکی

محض اس لیے ہے کہ وہ فنِ حدیث شریف کی منزلت، عظمت اور اس کی اہمیت سے واقف نہیں تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ایسی باتوں سے محفوظ رکھے۔ اس سلسلے کا ایک دوسرا قصہ بھی ہے جس کو ضیاء الدین برنی نے اپنی کتاب تاریخِ فیروز شاہی میں بیان کیا ہے کہ علاء الدین خلجی کے زمانے میں مشہور مصری محدث شیخ شمس الدین ہندوستان آئے جب وہ ملتان پہنچے اور وہاں کے علماء و فقہاء سے ان کی ملاقات اور علمی گفتگو ہوئی تو وہ یہ کہہ کر ہندوستان سے واپس چلے گئے کہ اس ملک میں علماء وفقہاء کے نزدیک احادیثِ رسول کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ شیخ شمس الدین نے اس مضمون کا ایک خط بھی علاء الدین خلجی کو لکھا تھا، لیکن علماء وفقہاء نے اس خط کو سلطان تک نہیں پہنچنے دیا۔

دوسرا دَور:

نویں صدی ہجری کے آخر میں ملتان کی علمی رونق ختم ہوگئی وہاں کے علماء ملتان کی سکونت چھوڑ کر کچھ لاہور چلے آئے اور کچھ دوسری جگہوں پر چلے گئے۔ انھیں میں شیخ عبداللہ بن الٰہ داد عثمانی تلنبی اور ان کے بھائی شیخ عزیز اللہ تلنبی ہیں۔ مقدم الذکر دہلی آئے اور ثانی الذکر نے سنبھل میں اقامت اختیار کی۔ اس وقت کے شہنشاہ دہلی سلطان سکندر لودی نے ان دونوں بھائیوں کی خوب آؤ بھگت کی اور ان کو بڑا اعزاز بخشا۔ شیخ عبداللہ کے متعلق مشہور ہے کہ جب یہ دہلی میں درس دیتے تھے تو سکندر لودی خود آ کر درس میں شریک ہوتا تھا اور اس خیال سے کہ اس کے آنے سے درس میں انتشار اور خلل نہ واقع ہو بہت خاموشی سے ایک گوشے میں چھپ کر بیٹھ جایا کرتا اور شیخ کے درس سے مستفید ومحفوظ ہوتا۔ شیخ عبداللہ شرح تہذیب کے مصنف عبداللہ یزدی کے شاگرد ہیں۔ اس لیے اُنھوں نے اس وقت ہندوستان کے نصابِ درس میں عضد الدین ایجی کی مطالع ومواقف اور سکاکی کی مفتاح العلوم کا اضافہ کیا۔ یہ کتابیں اس زمانے میں مقبول ومتداول رہیں۔

ملا عبدالقادر بدایونی نے اپنی تصنیف منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ دہلی میں شیخ

عبداللہ تلنبی اور سنبھل میں شیخ عزیز اللہ سکندر لودی کے زمانے میں اپنے وقت کے کبار علماء میں تھے۔ ملتان اُجڑنے کے بعد ان دونوں نے دہلی اور سنبھل میں اقامت اختیار کی اور نصابِ درس میں علومِ عقلیہ کی کتابوں کا اضافہ کیا۔ اس سے پہلے علمِ کلام میں شرح صحائف اور منطق میں شرح شمسیہ سے آگے کوئی کتاب پڑھانے کا رواج نہیں تھا۔

اس دوسرے دَور میں نصابِ درس میں جن نئی کتابوں کا اضافہ ہوا، وہ یہ ہیں:

میر سیّد شریف کی شرح مطالع اور شرح مواقف اور علامہ تفتازانی کی تلویح، مطول، مختصر اور شرح عقائد اور صدر الشریعۃ کی شرح وقایہ اور نحو میں لب اللباب اور ارشاد کے بجائے ملا جامی کی شرح کافیہ۔ نصابِ درس میں ان نئی کتابوں کے اضافے کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں جو علماء خراسان اور ماوراء النہر سے ہندوستان آئے وہ زیادہ تر میر سیّد شریف جرجانی، علامہ تفتازانی اور بعض ملا جامی کے شاگرد تھے۔ اس لیے ان علماء نے اپنے اساتذہ کی کتابوں کو نصابِ درس میں داخل کیا۔

تیسرا دَور:

اس عہد میں منطق و فلسفے سے شغف بہت زیادہ بڑھ گیا۔ ہندوستان کے تمام علمی مراکز میں منطق و فلسفہ کی کتابیں درس میں بکثرت داخل ہونے لگیں۔ خطیب ابوالفضل کا ذرونی اور عماد الدین محمد طارمی جب گجرات اور میر فتح اللہ شیرازی بیجاپور پہنچے اور اپنے ساتھ محقق دوانی صدر الدین شیرازی اور فاضل مرزا جان کی کتابیں لائے تو انھیں لوگوں نے بڑے شوق سے قبول کیا۔

شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ان میں بڑے مشہور عالم گزرے ہیں۔ اُنھوں نے نصابِ درس میں فلسفہ وحکمت کو شامل کیا۔ وہ بہت طویل مدت تک درس وافادہ کی مسند پر متمکن رہے اور ان کے بہت سے شاگرد فاضل و عالم بن کر نکلے۔ جن میں قاضی ضیاء الدین ساکن نیوتنی بھی ہیں۔ ان کے شاگرد شیخ جمال کوڑوی اور ان کے شاگرد لطف اللہ کوڑوی ہیں، شیخ لطف اللہ

کے شاگردوں میں شیخ احمد بن سعید امیٹھوی، شیخ علی اصغر قنوجی، قاضی علیم اللہ گچندوی اور شیخ محمد زماں کاکوروی ہیں اور ان کے علاوہ بھی بہت سے شاگرد تھے اور ہر ایک نے اپنی اپنی جگہ درس و افادہ کی مسند بچھائی۔

میر فتح اللہ شیرازی نے اپنی اخیر عمر میں بیجاپور چھوڑ کر آگرہ آ کر دربارِ اکبری میں قیام کیا۔ اور وہاں بڑی محنت اور توجہ سے درس و افادہ کا سلسلہ شروع کیا۔ ان کے شاگردوں کی تعداد بے شمار ہے۔ ان میں سے ایک مفتی عبدالسلام لاہوری ہیں جن کے شاگردوں میں مفتی عبدالسلام دیوی بہت مشہور ہیں۔

مفتی عبدالسلام دیوی اپنے وقت کے مشہور اور باکمال اساتذہ میں تھے اور علماء کی ایک بڑی تعداد ان کی شاگرد تھی۔

شیخ محمد افضل ردولوی ثم جونپوری اور شیخ محب اللہ صدر پوری ثم الٰہ آبادی اور قاضی عبدالقادر لکھنوی طلبِ علم کے لیے لاہور تشریف لے گئے وہاں سے کامیاب ہو کر شیخ محمد افضل نے جونپور میں طرحِ اقامت ڈالی۔ اور استاذ الملک کہلائے اور شیخ محب اللہ نے الٰہ آباد کو اور قاضی عبدالقادر نے لکھنؤ کو اپنے قیام کا مرکز بنایا۔ ان باکمال اساتذہ کے علمی فیضان نے پورے دیارِ مشرق کو اپنے آغوش میں لے لیا اور انھیں کے شاگردوں میں سے شیخ قطب الدین بن عبدالحکیم انصاری سہالوی بھی ہیں۔ یہ اپنے وقت میں جملہ علوم وفنون کی تحصیل کا مرجع تھے۔ میر غلام علی بلگرامی بن نوح حسینی نے اپنی کتاب ماثر الکرام میں لکھا ہے کہ ایران کے متاخرین علماء مثلاً محقق دوانی، محقق شیرازی اور منصور و مرزا جان کی کتابوں کو ہندوستان میں رواج دینے والے میر فتح اللہ شیرازی ہیں۔ اُنھوں نے ان مصنفین کی کتابوں کو درس میں داخل کیا۔ اور اس طرح ہندوستان میں منطق وفلسفہ کا عام رواج ہو گیا۔

اس زمانے میں ہندوستان کے بعض علما حج و زیارت کے لیے حجاز تشریف لے گئے۔ اُنھوں نے وہاں کے مشہور محدثین کی خدمت میں رہ کر علمِ حدیث حاصل کیا اور ان کے ذریعے علمِ حدیث ہندوستان میں پہنچا۔ مثلاً صاحبِ مجمع البحار شیخ محمد بن طاہر علی پٹنی اور شیخ یعقوب بن

حسن کشمیری اور شیخ عبدالنبی گنگوہی وغیرہ۔ اور بعض علماء نے گجرات جا کر درس و افادہ کی مسند بچھائی۔ مثلاً شیخ عبدالمعطی اور شیخ عبداللہ ورحمت اللہ وغیرہ۔

اس طرح علمِ حدیث کا گجرات کے اطراف میں رواج ہوا۔ بعض علماء دہلی و آگرہ بھی آئے مثلاً سیّد رفیع الدین شیرازی، شیخ بہلول بدخشی اور حاجی اخری اور میر کلاں، ان لوگوں نے بھی دہلی و آگرہ میں حدیث کو رواج دیا۔ لیکن مجموعی طور پر اس فن شریف کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہوئی — لوگوں کا انہماک وشغف فلسفہ ومنطق سے بدستور قائم رہا۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا کہ بعد میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی بن سیف الدین نے فنِ حدیث شریف کے درس کی طرف خصوصی توجہ فرمائی اور ان کی ساری کوششیں اس علم شریف کی اشاعت میں صرف ہوئیں۔ اس طرح ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے بہت سے بندوں کو نفع پہنچا اور فنِ حدیث کا رواج ہوا۔

چوتھا دَور:

یہ دور درحقیقت دوسرے اور تیسرے دَور کا تکملہ ہے۔ فلسفہ اور منطق کا رواج ہندوستان میں بہت زیادہ ہو گیا تھا۔ ان دونوں علوم کی کتابوں کا نصاب میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ نظام الدین سہالوی فرنگی محلی نے ہندوستان کے نصاب درس کو ایک نئی شکل دی اور اس کو باقاعدہ منظم ومرتب فرمایا۔ اسی کو آج کل لوگ پڑھ پڑھا رہے ہیں اور اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔ اس نصابِ درس کی تفصیل ہر فن کی کتابوں کے ساتھ درج ذیل ہے:

علم الصرف: میزان، منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرفِ میر، فصول اکبری اور شافیہ ابنِ حاجب۔

نحو: نحوِ میر، شرح ماۃ عامل، ہدایۃ النحو، کافیہ، شرح ملا جامی تا بحث حال بلاغت، مختصر المعانی، مطول، تا بحث ما انا قلت۔

منطق: صغریٰ، کبریٰ، ایساغوجی، تہذیب، شرح تہذیب، قطبی میر قطبی، سلم العلوم، میر زاہد رسالہ، میر زاہد ملا جلال۔

فلسفہ: میبذی کی شرح، ہدایۃ الحکمہ، ملا صدرا شیرازی کی شرح ہدایۃ الحکمہ، معروف بہ صدرا تا بحث مکان اور شمس بازغہ مصنفہ ملا محمود جونپوری۔

ریاضی: خلاصۃ الحساب باب التصحیح، تحریر اقلیدس کا مقالہ اوّل، تشریح الافلاک، توشجیہ، اور شرح چغمنی کا باب اوّل۔

فقہ: شرح وقایہ کا نصف اوّل اور ہدایہ کا نصف ثانی۔

اصول فقہ: نور الانوار، تلویح، مقدماتِ اربع تک اور مسلم الثبوت مبادی کلامیہ تک۔

علم کلام: تفتازانی کی شرح عقائد تا بحث سمعیات، محقق دوانی کی شرح عقائد کا جز اوّل اور میر زاہد شرح مواقف تا بحث امورِ عامہ۔

تفسیر: جلالین شریف، بیضاوی تا سورہ بقرہ،

مناظرہ: رشیدیہ

حدیث: مشکوٰۃ المصابیح تا کتاب الجمعہ۔

اس نصابِ درس کی خصوصیت دقتِ نظر اور قوتِ مطالعہ کی بہم رسانی ہے، اس نصاب کو پڑھنے کے بعد طالب علم میں قوتِ مطالعہ اور ادق سے ادق مضامین کو کتاب سے سمجھ لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح گو وہ بالفعل صاحبِ فضل و کمال نہیں ہوتا لیکن تھوڑی سی محنت کے بعد وہ ایک اچھا صاحبِ علم بن سکتا ہے۔

اس عہد میں شاہ ولی اللہ اور ان کی اولاد و احفاد کی ذات ملتِ اسلامیہ ہندیہ کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت تھی۔ اس خاندان نے علمِ حدیث کی نشر و اشاعت میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا اور ان سے بے شمار حضرات نے علمی استفادہ کیا۔

موجودہ عہد:

ہمارے زمانے میں جو نظامِ درس اور کتبِ درسیہ رائج ہیں۔ ان کا معاملہ عجیب ہے۔ مذکورہ بالا درسِ نظامیہ میں بہت سی کتابوں کا اضافہ بغیر غور وفکر اتفاقیہ طور پر ہو گیا ہے اور عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ کتابیں ابتدا ہی سے درسِ نظامیہ میں موجود ہیں۔ ملا نظام الدین کے بعد منطق میں میر زاہد رسالہ کے حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک کی شرح سلم بحث تصدیقات، ملا حسن کی شرح سلم بحث تصورات کا اضافہ ہوا اور بعض مدارس میں ملا مبین کی شرح سلم، میر زاہد رسالہ کا حاشیہ بحر العلوم، میر زاہد رسالہ کا حاشیہ ملا مبین بھی نصاب میں شامل کر لیا گیا۔

مولانا فاروق چریا کوٹی نے مجھے اس سلسلے میں ایک عجیب بات بتائی۔ ان سے مفتی یوسف لکھنوی بن شیخ اصغر نے بیان کیا کہ قاضی مبارک کے شاگرد اپنے استاذ کی شرح سلم قاضی مبارک پڑھا کرتے تھے اور ملا حمد اللہ کے شاگرد اپنے استاذ کی شرح سلم حمد اللہ پڑھا کرتے تھے۔ اور علامہ بحر العلوم کے شاگرد اپنے شاگردوں کو شرح مسلم بحر العلوم پڑھایا کرتے تھے اور جب ایک دوسرے کے شاگرد آپس میں ملاقات کرتے تھے تو ہر ایک اپنے استاذ کی تصنیف کا تذکرہ کرتا تھا اور دوسرے کی تصنیف پر نقد و جرح کیا کرتے تھے۔ اس طرح سلم العلوم کی تمام شرحیں علمی گفتگو اور بحث کا موضوع بن گئیں اور طلباء و علماء مجبور ہو گئے کہ ان تمام شرحوں سے ربط و اشتغال قائم رکھیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فنِ منطق میں درجۂ کمال و مہارت کے لیے ضروری ہو گیا کہ ان جملہ شروح وحواشی کو پڑھا اور پڑھایا جائے۔

(بہ شکریہ 'اسلام اور عصرِ جدید'، دہلی، اکتوبر ۱۹۷۰ء)